,,زنـدہ رود ،،
ڈاکٹر محمد اقبال پر ایک دلآویز کتاب

سید صباح الدین عبدالرحمن

ڈاکٹر محمد اقبال کے فرزند ارجمند کی کتاب ,, زندہ رود ،، کی پہلی جلد پر راقم نے جون ۱۹۸۱ء کے معارف میں بہت ھی لطف و لذت کے ساتھ ایک تبصرہ لکھا تھا ، اس کی دوسری جلد موصول ہوئی تو اس کو کئی بار شوق سے پڑھا، اور ہر بار پڑھنے میں یہ محسوس ہوا کہ یہ روایتی قسم کی سوانح نگاری نہیں ، یا شعر و ادب پر ایک رسمی تبصرہ بھی نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت کا ایک تحفۂ بہار ہے جس پر رنگ برنگ کے پھول کھلے ھیں ، یہ اس کتاب کے لائق مرتب کے انداز بیان اور تصنیفی خوش سلیقگی کی خوبی ہے۔

اب تک ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے سوانح حیات اور کلام پر معلوم نہیں کتنی کتابیں نکل چکی ھیں ، زیر نظر کتاب کا بھی یہی موضوع ہے اس میں بہت سی باتیں تو ایسی ھیں جو اور کتابوں سے لی گئی ھیں لیکن اسی پرانی شراب میں اس کے مصـنف نے اپنے خیالات کی مے ارغوانی سے دو آتشہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس میں اجمال اور تفصیل کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ یہ پر از معلومات بھی ہے،پر کیف بھی ، دلچسپ بھی اور لائق غور و فکر بھی، اس کا

وصف یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے جزوی واقعات ان کے ذاتی خیالات اور ان کے اشعار کے نظری و فکری افکار کے ساتھ اس زمانہ کے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے سیاسی واقعات کو اس طرح سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ کتاب روایتی اور رسمی انداز کی نہیں، اس لیے اس پر تبصرہ بھی اس انداز کا نہیں ہونا چاہیئے، اس کے خاص خاص واقعات کو پڑھنے میں ایسی لذت محسوس ہوئی کہ ان کو معارف کے ناظرین تک پہنچانے میں قلم بے اختیار ہو گیا ہے، اس لیے یہ تبصرہ کے بجائے مستقل ایک مقالہ بن گیا ہے۔ راقم اس طرح اپنے کاوہ کاٹنے اور قلم کے چھلاوہ پن کے لیے معذرت خواہ ہے۔

پہلی جلد ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ابتدائی دور پر مشتمل تھی، اس دوسری جلد میں ان کی حیات کے وسطی دور کی تفصیلات ہیں، اس کے ابواب کا تسلسل پہلی جلد کے ساتھ رکھا گیا ہے، جو ساتویں باب پر ختم ہو گئی تھی، اس لیے زیر نظر کتاب کا آغاز آٹھویں باب سے کیا گیا ہے، جس کا عنوان ,, فکر معاش " ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب یورپ سے واپس آئے تو بیرسٹری شروع کی، مگر اپنے اس پیشہ کی آمدنی سے مطمئن نہ تھے گو ان کا خود بیان ہے کہ ان کو اپنے لیے مالی نقطۂ نظر سے غور کرنے میں دلی کراہت ہوتی رہی، وہ چاہتے تو ایم. اے او کالج علی گڑھ یا گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہو سکتے تھے۔ مگر ان کا خیال رہا کہ سرکاری ملازمت سے قوت عمل کے سلب ہونے کا احتمال تھا۔ ان کی نظر حیدر آباد کی مسلم ریاست کی طرف اٹھی، جہاں رہ کر مالی فارغ البالی اس لیے چاہتے تھے کہ وہ اپنی قوت فکر کا رخ موڑ سکیں۔ ان کی روح کی گہرائیوں میں یہ احساس مضطرب تھا کہ انکا اصل مقدر شعر کے ذریعہ

ایک نیا پیغام عالم اسلام تک پہنچانا ہے اس کے لیے انھوں نے حیدر آباد دکن کا سفر بھی کیا ۔ گو وہاں ان کے پیش نظر کوئی خاص ملازمت نہ تھی ، مہاراجہ سرکشن پرشاد کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق ، سر اکبر حیدری اور دوسرے اکابر کی پذیرائی کے باوجود وہاں یہ صورت ممکن نہ ہوسکی ۔ مصنف کا خیال ہے کہ اگر نظام اس وقت کوئی مناسب منصب پیش کرتے تو وہ قبول کر لیتے ۔ اگر ان کو وہاں وہ مالی اطمینان حاصل ہو جاتا جس کی ان کو ضرورت تھی تو شاید صنف شاعری اس سے زیادہ مالا مال ہوتی جتنی کہ ہو سکی ۔ اس زمانہ میں فکر معاش کے سلسلہ میں انھوں نے جو ذہنی کرب و اضطراب کا دور گذارا اس کا بڑا اچھا تجزیہ اس باب میں ہے ۔ لائق مصنف نے اس کی خشکی میں ڈاکٹر صاحب کی خوش طبعی ، دوست نوازی ، مجلس آرائی،معاصر اکابر کے تعلقات کی رنگا رنگی ، قومی کاموں سے دلچسپی ، انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں نغمہ سرائی اور شعر و ادب سے ہم آغوشی کی پر از لطف تفصیلات سے رنگینی پیدا کر دی ہے ، ان کے کردار کا یہ بھی روشن پہلو ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مہاراجہ سرکشن پرشاد ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انھیں فکر معاش سے نجات دلانے کے لیے ان کے شایان شان وظیفے کی پیش کش کی ، مگر انھوں نے اس لیے اس کو منظور نہیں کیا کہ ان کے خیال میں یہ بات مروت اور دیانت کے خلاف ہوتی کہ وہ ایک بیش قرار تنخواہ پائیں اور اس کے عوض وہ کوئی ایسی خدمت نہ کر سکیں جس کی اہمیت بقدر اس مشاہرہ کے ہو (ص ۱٦۸) حیدر آباد کے سفر میں مقتدر شخصیتوں کے علاوہ نظم طباطبائی ، غلام قادر گرامی ، جلیل حسن جلیل، مانک پوری اور ظہیر دہلوی سے ان کی جو ملاقاتیں ہوئیں وہ شعر وادب کی بڑی دلچسپ کہانی ہے جس کو قلمبند کرنے میں مصنف نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے ۔

حیدر آباد هی کے سفر میں انهوں نے گولکنڈه کے قطب شاهی بادشاهوں کے مقبروں کو جاکر دیکها، تو اپنی وه نظم لکهی جو ,,گورستان شاهی،،کی سرخی کے ساتھ بانگ درا میں ہے ، مهاراجه سرکشن پرشاد کی تعریف میں ایک قصیده ,, شکریه ،، کے عنوان سے تحریر کیا لیکن ان کے کسی مجموعه میں یه نظر نہیں آیا ، اسی باب میں ان کی نظموں میں سے ,, پیام عشق ،، ,, بلادِ اسلامیه،، ,, فلسفۂ غم ،، ,, پهول کا تحفه عطا هونے پر ،، ,, ... کی گود میں بلی دیکھ کر،، شکوه ، ترانه ملی حضور رسالتمآب میں ، شمع اور شاعر ، اور جواب شکوه کا ذکر کرکے یه بهی دکهایا گیا ہے که کن حالات میں یه نظمیں لکهی گئیں ، جن سے ان کے پڑهنے میں اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے پهر بانگ درا کی هر نظم سے متعلق یه خواهش پیدا هوتی ہے که اس کے متعلق بهی اس کی وضاحت هو جاتی که اس کے لکهنے میں کیا عوامل کارفرما رهے مصنف نے اپنے آینده ابواب میں بہت سی نظموں سے متعلق ایسی وضاحت کر دی ہے ـ

اس باب میں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی ملی، سیاسی ، تعلیمی اور معاشرتی سرگرمیوں کی بهی تفصیل ہے جس کو پڑھ کر یه اندازه هوتا ہے که ان کی سرگرمیوں کی نوعیت ایسی رهی جیسے بهرے هوئے دودھ کے پیاله کے اوپر گلاب کی پنکهڑیاں رکهی هوئی رهتی هیں ، ایسے کاموں سے انکی دلچسپی ضرور رهی، لیکن جہاں اور جب ان کا دامن کانٹوں سے الجهتا هوا نظر آیا ـ فوراً اس کو سمیٹ لیا ، وه کسی سے متصادم یا بر سرپیکار نہیں هوئے ـ یہی وجه ہے که لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت برابر قائم رهی ـ ۱۹۱۱ء آتے آتے وه مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر چکے تهے ـ

اس باب سے پہلی دفعه راقم کے ساتھ دار المصنفین والوں کو معلوم هوا که دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

کا اجلاس دهلی میں هوا تو یه طے هوا که اس میں ڈاکٹر صاحبؒ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے مولانا شبلیؒ ان کے گلے میں پھولوں کا هار ڈالنے کی رسم ادا کریں، اس کی تفصیل مصنف نے جس خوش سلیقگی سے لکھی ہے، اس کے مطالعه سے نه صرف ڈاکٹر صاحب کی عظمت میں اضافه هوتا ہے۔ بلکه اس زمانه کے اکابر کے عزت و توقیر کا بھی نقش دل میں بیٹھ جاتا ہے، اس موقع پر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، سر آغا خان، سید حسین بلگرامی، خواجه کمال الدین، سید سجاد حیدر، اور ملک کی دوسری شخصیتیں موجود تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس اجلاس کی تیسری نشست کی صدارت کی، خواجه کمال الدین نے اپنی ایک تقریر ,, اسلام اور علوم جدیده ،، کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرتے هوئے کہا۔

,,کہاں ہے تو ڈاکٹر اقبال ! خدائے تعالیٰ تجھے دین و دنیا میں بااقبال کرے، تیرے نادر قوائے ذهن بھی دنیا کی نظر سے چھپے هوئے هیں . وہ ذهنی قابلیتیں اور استعدادیں هیں که ان کا ٹھیک استعمال بقائے دوام کا تاج تیرے سر پر رکھ سکتا ہے، لیکن یه خاص الخاص قوی تجھے اس لیے عطا نہیں هوئے که تو ,,فی کل واد یهیمون،،کا مصداق بن کر ایک بے ثمر باغ میں جس کا نام مشاعرہ ہے گلگشت کرے ،اب وقت ہے اٹھ اور حقیقی تلمیذ الرحمن بن ! عالم سفلی کو چھوڑ اور طائر قدس هو جا ...... وہ هار جو قوم تیرے گلے میں عملاً ڈال رهی ہے اور تو اس کا حقیقی طور پر مستحق ہے وہ ان گلهائے فردوس بریں کے مقابل کیا حقیقت رکھتے هیں جو خدمت قرآن تیرے لیے وقف کر سکتی ہے، قوم تجھے ملک الشعراء بنانا چاهتی ہے، اور وہ ایسا کرنے میں غلطی پر ہے، اور تو پست همت هوگا اگر اس پر قانع هوا، میں تجھ میں رازی اور غزالی کا بروز دیکھنا چاهتا هوں،، .

اگر خواجه کمال الدین لمبی عمر پاتے تو وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات سے ان کی جو امیدیں تھیں، وہ پوری ہوئیں،جس نشست میں علامہ شبلیؒ نے ان کے گلے میں ہار پہنایا، اس کی صدارت شاہ سلیمان پھلواروی نے کی جنھوں نے اس تقریب کے سلسلہ میں فرمایا :

,,اقبال صاحب کے لیے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے اور ہمیں بھی بڑی مسرت ہے کہ اس جلسہ میں انھوں نے علامہ شبلیؒ کے مقتدر ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے، نام بھی مبارک ، کام بھی مبارک ۔ پھولوں کا ہار بھی مبارک اور ہار ڈالنے والے کا دست کرم بھی مبارک ،، ۔

خود علامہ شبلیؒ نے ہار پہنانے سے پہلے یہ فرمایا :

,,یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں اس کو محض تفریح نہ تصور کرنی چاہیئے، ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں، اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی ...... جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے ، وہ ان کیلئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے ، اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں ،، ۔

یہ واقعہ حیات شبلیؒ میں درج نہیں ، شاید اس کے مصنف استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذہن سے اتر گیا ہو ، لائق مصنف نے اس کی تفصیل لکھ کر علامہ شبلی کے پرستاروں کو اپنا ممنون کرم بنایا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے ساتھ دار المصنفین والوں کو ڈاکٹر صاحبؒ سے جو والہانہ محبت رہی وہ غالباً غیر شعوری طور پر اسی عقیدت کی کڑی ہے جو علامہ شبلیؒ سے شروع ہوئی ۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے جو تقریریں کیں وہ اس لیے اهم هیں که ان کے بنیادی خیالات و افکار معلوم هوں گے جو اس وقت سے ان کی آخری زندگی تک ان پر حاوی رهے ۔ ان تقریروں کو یکجا کرکے مصنف نے ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے اور سمجھانے میں مفید خدمت انجام دی ہے ,,اسلام اور علوم جدیده ،، پر خواجه کمال الدین کی تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے جو کچھ کہا اس کے کچھ ٹکڑے یه هیں ۔

,,میں دعویٰ سے کہه سکتا هوں که اسلام مغربی تهذیب کے تمام اصولوں کا سرچشمه ہے ، لیکن ڈی کارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے هیں ۔ جن کے فلسفه کی بنیاد تجربه اور مشاهده پر ہے ۔ لیکن ڈی کارٹ کا میتھڈ امام غزالی کی احیاء العلوم میں موجود ہے ۔ ان دونوں میں اس قدر تطابق ہے که ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے که اگر ڈی کارٹ عربی جانتا تو هم ضرور اعتراف کرتے که وه سرقه کا مرتکب هوا ہے ، راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافته تھا ، جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے، بعینه وهی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا تھا ، مل کے فلسفه کے تمام بنیادی اصول شیخ بو علی سینا کی مشهور کتاب شفا میں موجود هیں ، غرض که تمام وه اصول جن پر علوم جدیده کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجه هیں ، بلکه میرا دعویٰ ہے که نه صرف علوم جدیده کے لحاظ سے بلکه انسان کی زندگی کا کوئی پهلو ایسا نهیں ہے جس پر اسلام نے بے انتها روح پرور اثر نه ڈالا هو ۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے ان هی خیالات کو اپنی کتاب ,, اسلام کی تشکیل جدید،، (Reconstruction of Islam) میں وضاحت کے ساتھ پیش

کیا ہے ، جس کے بعد ایسے اہل قلم کے اس دعوی کی تردید ہو گئی جو یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے افکار اِس اور اُس یورپی فلسفی سے مستعار ہیں جب علامہ شبلیؒ نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا تو انھوں نے یعنی ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑی بلند آہنگی سے فرمایا :

,,میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام اور ہماری قوم کا ہے ، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا ، شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی، اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے اپنی نظموں کے ذریعہ سے قوم کو پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی ـ،،

یہ تقریر ۱۹۱۱ء کی ہے ، اس میں جس خواہش کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے کیا تھا وہ الحمد للہ پوری ہوئی، یورپ میں تعلیم پانے کے باوجود خالص سلفی بن کر اپنی شاعری میں اسلامی روح کی ترجمانی پوری کامیابی کے ساتھ کی اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بیسویں صدی میں مسلمانوں کو جن مصلحین نے نشاۃ ثانیہ عطا کی ان میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے ، اس کی تفصیل ڈاکٹر جاوید اقبال نے زیر نظر کتاب میں بڑی خوش سلیقگی سے پیش کی ہے ـ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بھی غور طلب ہے :

,,جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مزار پر جایا کرتا ہوں، اور وہاں کے دیگر مزارات پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں ـ،،

اس طرح بعض لوگوں کی نظر میں یہ شاعر مشرق اور فلسفی اسلام بدعتی بھی رہا ـ

دوسرا باب ,,ازدواجی زندگی کے بحران،، کے عنوان سے ہے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے پاؤں کے چھالوں میں بہت سے کانٹے پڑے ۔ ان کو ان کے فرزند ارجمند جناب جاوید اقبال نے نوک سوزن سے نکالے ھیں، اس باب میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بہت سی ایسی باتیں آ گئی ھیں جن پر مصنف مشرقی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے پردہ ڈال سکتے تھے لیکن انھوں نے مغربی طرز کی معروضیت اختیار کرکے ایسی تمام باتوں کو زیر بحث لاکر ایک بڑی اچھی ذھنی ضیافت کا سامان مہیا کر دیا ہے ، اپنے والد بزرگوار کی ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں لکھتے ھیں کہ ان کی پہلی شادی ناکامی اور تلخی میں ختم ہوئی اور اس کی اصل وجہ یہ بتائی ہے کہ زوجین کے طبائع کی عدم مناسبت تھی ، شادی کے وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر سولہ برس اور ان کی بیوی کی عمر انیس برس تھی ان کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کا خاندان ایک چھوٹے سے مکان میں رھتا تھا لیکن ان کی بیوی نے ایسی حویلی میں پرورش پائی جو کسی محل سے کم نہ تھی ، ان کی بیوی کے والد ڈاکٹر تھے جن کے یہاں دولت کی فراوانی تھی ، گورنمنٹ کالج لاھور سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ملازمت کی تو ان کی تنخواہ بہتر روپے چودہ آنے مقرر ہوئی جو چار سال کے بعد دو سو پچاس روپے ماھوار تک پہنچی ۔ اس کے بعد وہ یورپ چلے گئے ، واپس آئے تو ان کے لیے بڑا مسئلہ فراھمی روز گار کا تھا ، ایسی حالت میں متمول گھرانے کی یہ بیوی ان سے قریب تر نہ ہو سکیں ، ان کا انداز طبیعت بھی کچھ ایسا تھا کہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آگئی لیکن ان کے کردار کا یہ روشن پہلو ہے کہ انھوں نے طلاق لینا گوارہ نہیں کیا ، کفاف لے کر مطمئن ہو گئیں ، ڈاکٹر صاحب ایک مقررہ رقم ان کو ھر مہینہ آخر وقت تک بھیجتے رھے ، ان سے ایک لڑکی معراج

بیگم اور ایک لڑکا آفتاب اقبال ھوا، معراج بیگم کو اپنے والد بزرگوار سے بڑی محبت رھی ۔ گو وہ ماں باپ کے کشیدہ تعلقات پر اندر اندر کڑھتی رھیں ، ان کی وفات انیس برس کی عمر میں ھوگئی، آفتاب اقبال کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ھیں کہ وہ اپنے دادا کے منظور نظر رھے ۔ لیکن باپ سے قریب تر نہیں ھوئے ۔ ان کے ذھن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کی ماں کے ساتھ ان کے باپ نے ناانصافی کی ۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی ازدواجی زندگی کو سنوارنے کے لیے ایک دوسرا نکاح کیا ، اس سلسلہ میں مصنف نے یہ لکھ کر دلچسپ معلومات فراھم کی ھیں کہ وہ یعنی ڈاکٹر صاحب روشن خیال ھونے کے باوجود بعض معاملات میں قدامت پسندی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ھوتے ، وہ کسی اعلی تعلیم یافتہ سے شادی کر سکتے تھے مگر ان کو ایسی خاتون کی تلاش تھی جو ان کی بیوی کی حیثیت سے ان کے خاندان کے افراد سے گہرا تعلق اور وابستگی قائم رکھ سکے ، اس باب سے یہ معلوم ھوا کہ عطیہ فیضی ان سے شادی کرنے کی خواھشمند تھیں ، مگر ڈاکٹر صاحب نے کبھی ان کا نوٹس نہیں لیا ، وہ انھیں ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کر سکتے تھے لیکن بیوی کے روپ میں وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھیں (ص ۱۷۹) ۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا دوسرا نکاح سردار بیگم سے ھوا، جو ڈاکٹر جاوید اقبال کی ماں ھوئیں ، اس نکاح کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تین سال تک رخصتی نہیں کرائی ۔ اس کی جو وجہ مصنف نے لکھی ہے وہ ان کے انداز بیان کی معروضیت کی انتہا ہے، وہ اس کو آسانی سے حذف کر سکتے تھے ، مگر بڑی صاف گوئی سے لکھا ہے کہ رخصتی کا معاملہ اس لیے التواء میں پڑ گیا کہ نکاح کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کو دو ایک گمنام خطوط موصول ھوئے، جن میں سردار بیگم کے چال چلن

پر نکتہ چینی کی گئی تھی اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک متمول کشمیری خاندان کی لڑکی مختار بیگم سے شادی کر لی ۔ اور سردار بیگم کو طلاق دے دینے کا ارادہ کر لیا، مگر پھر ان کو یہ معلوم کرکے بڑا دکھ ہوا کہ گمنام خطوط لکھنے والا ایک وکیل تھا جو سردار بیگم سے اپنے بیٹے کی شادی کرانا چاہتا تھا ۔ یہ نہ ہوا تو اس نے گمنام خطوط میں یہ بہتان رکھ دیا، پھر سردار بیگم نے خود جرأت کرکے ایک خط ڈاکٹر صاحب کو لکھا کہ اس بہتان پر ان کو یقین نہ کرنا چاہیئے تھا ، میرا نکاح تو آپ سے ہو چکا ہے اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی ۔ اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روز قیامت میں آپ کی دامنگیر ہوں گی ۔ یہ خط پڑھ کر ڈاکٹر صاحب اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوئے اور جب اپنی بیوی مختار بیگم کو یہ بتایا تو وہ رونے لگیں ، ڈاکٹر صاحب سردار بیگم کو گھر لانے کے لیے تیار ہو گئے مگر ان کی یہ احتیاط قابل ذکر ہے کہ ایک مرحلہ پر وہ انکو طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے، اس لیے ان سے دوبارہ نکاح پڑھوایا ، یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے ، دونوں بیویاں اپنی نیک نفسی کی وجہ سے پیار اور محبت سے رہنے لگیں ، ڈاکٹر صاحب کا یہ فیصلہ مبارک ثابت ہوا اس لیے کہ اس کے بعد ان کے گھر میں چھل پہل رہنے لگی ، وہ اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ تاش اور لوڈو کھیلتے یا کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑاتے ۔ سردار بیگم ھی سے اللہ تعالٰی نے انہیں جاوید اقبال جیسا خوش رو، خوش خصال اور خوش عقیدہ فرزند ارجمند عطا کیا، جنھوں نے اپنی خدا داد لیاقت سے نہ صرف اپنی زندگی کامیاب بنائی بلکہ اپنے قابل فخر باپ کی حیات اور کلام کو سمجھانے میں ایسی دلآویزی پیدا کی جو ان سے پہلے کوئی اور نہ کر سکا تھا ۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے مخالفین نے ان کی کردار کشی اور سطوت

شکنی کی جو مہم چلائی اس کی بھی پوری تفصیل اس باب میں ہے مصنف نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اپنے والد بزرگوار کے متعلق یہ لکھا ہوگا :

,,ان کی زندگی میں ان پر شراب نوشی کا الزام لگا ۔ انہیں عیاش ظاہر کیا گیا اور یہ من گھڑت قصہ بھی مشہور کیا گیا کہ ایام جوانی میں وہ ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے،، (ص ۱٦۹) ۔

ان باتوں کا ذکر اس کتاب میں نہ ہوتا تو اس کی خوبی پر کوئی اثر نہ پڑتا ، مگر ان کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں باپ کی طرف سے بیٹے کی مدافعت یا حسن تاویل مطلق نظر نہیں آتا، بلکہ اس بحث میں مستند شواھد و بیانات کا ڈھیر لگا کر معروضیت اور حقیقت پسندی کی شان پیدا کر دی گئی ہے ۔ جس کے بعد مصنف کے اس نتیجہ سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ الزامات کم علم ملاؤں، عہد تنزل کی شاعری کے پرستاروں ، احمدیوں، سوشلسٹوں، ترقی پسند مصنفوں اور خام صوفیوں نے ر کھ کر مشتہر کیا ، اور ان کو اس سے بھی مدد ملی کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ظرافت طبعی سے ھنسی مذاق میں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالتے جن کو ان کی پارسائی کے بجائے ان کی رندی پر محمول کیا جاتا ، مصنف نے اس کی طرف کھل کر اشارہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب رقص، و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتے، اس لیے کہ ان کو موسیقی سے شغف رہا لیکن ان کی یہ زندگی ۱۹۱۳ء میں ختم ہو چکی تھی ، پھر وہ پورے وثوق کے ساتھ لکھتے ھیں کہ ایسی کوئی موثر شہادت موجود نہیں جس سے ان کی مے نوشی ثابت ہو، پھر وہ ایسے مستند بیانات بھی نقل کرتے ھیں جن سے اس الزام کی پوری تردید ہو جاتی ہے مثلاً خود عطیہ فیضی کا بیان ہے کہ انھوں نے یورپ میں کسی موقع پر ان کو

شراب پیتے نہیں دیکھا ۔ پھر یہ واقعہ بھی درج کیا گیا ہے کہ کیمبل پور میں ان کے ایک وکیل دوست نے ایک دعوت میں شراب کا جام پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جس شے کو میں نے یورپ میں رہ کر کبھی منہ نہیں لگایا، اسے اب کیا پیوں گا، اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میکلوڈ روڈ پر ان کی دو بھتیجیاں ساتھ رہتی تھیں، ان میں ایک کا حلفیہ بیان ہے کہ انھوں نے کبھی شراب سے شغف نہیں رکھا، اسی طرح ان کے بے تکلف دوستوں میں مرزا جلال الدین، سردار امراؤ سنگھ، اور خواجہ عبدالوحید کے بیانات ھیں کہ انھوں نے کبھی ان کے سامنے شراب نہیں پی، اور نہ انھوں نے کسی سے سنا کہ انھوں نے شراب کو ھاتھ لگایا، خود ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے بچپن میں کبھی ان کو شراب پیتے نہیں دیکھا ۔

ڈاکٹر صاحب پر جو یہ الزام ہے کہ وہ ایام جوانی میں ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے اس کے متعلق ڈاکٹر جاوید رقم طراز ھیں کہ یہ ایک اختراع ہے ان کا کلام خنجر و شمشیر، تیر و تفنگ کے ذکر سے ضرور بھرا ھوا ہے لیکن وہ عید قرباں کے موقع پر بکرے کو ذبح ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے ، ایسا شخص قتل کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہے ؟ ۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ کہنا کہ ان کی خوش طبعی سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ھوئیں وہ اپنی ظرافت میں رند ضرور رہے ، لیکن یہ رندی خیالی اور لفظی تھی، جسے ان کی رندی کہا جا سکتا ہے وہ سب اسرار خودی سے پہلے کے لطائف ھیں جن کو بقول محمد دین تاثیر، سرشادی لعل نے ان کو ھائی کورٹ کی ججی سے روکنے کے لیے اور چند ان کے ہم پیشہ مسلمان مشاھیر نے اپنے مطالب کی خاطر خوب بڑھا چڑھا کر شہرت دی ، ورنہ ایسا تہجد خوان، عاشق رسولؐ، اولیاء کا خادم اور عقیدت مند ، خوش عقیدہ اور گداز

قلب مسلمان انگریزی دانوں میں کم دیکھا گیا (ص ۱۸۱) ۔

۳۴ ۔ ۱۹۳۳ء میں راقم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا تو وہاں کے نوجوان طلبہ اپنی تفریحی گفتگو میں ڈاکٹر صاحب سے متعلق بعض ایسی باتیں بیان کر جاتے جن کو یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ، زیر نظر کتاب کے اس باب کو پڑھ کر یہ خیال ہوا کہ میرا یقین نہ کرنا کتنا صحیح تھا ، آیندہ جب کوئی ڈاکٹر صاحبؒ کے کلام کے ساتھ ان کی نجی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہے گا تو اس کے لیے یہ باب پڑھنا ناگزیر ہوگا جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محض بدباطنی اور خباثت نفس سے ایک محبوب اور جلیل القدر شخصیت کو کس طرح مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ۔

اس کتاب کے تیسرے باب میں ڈاکٹر صاحب کے ذہنی ارتقاء کو ان کے ان نثری مضامین سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو انھوں نے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۵ء تک اردو اور انگریزی میں لکھے ، اب تک یہ جائزہ زیادہ تر ان کی شاعری کے ذریعہ سے لیا جاتا رہا ہے لیکن اس باب میں ان کی نثری تحریروں میں جو مباحث ھیں، ان سے ان کے افکار و خیالات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ، ان سے ہم اپنے ناظرین کو بھی مختصر طریقہ پر روشناس کراتے ھیں :

۱۹۰۴ء میں انھوں نے ,,قومی زندگی،، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں مسلمانوں کی زوال پذیری ان کے امراء کی عشرت پسندی ، ان کی عورتوں میں تعلیم کے فقدان، ان کی بے جا نام و نمود کی خواھش ، ان کے شادی بیاہ میں بعض قبیح رسوم اور فضول خرچی اور صنعت و حرفت سیکھنے میں ان کی عدم توجہ پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے فرد اور قوم کے تعلق پر بحث کی اور آخر میں اس پر زور دیا کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بنیاد پر جو

استدلال فقہاء نے وقتاً فوقتاً کیے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے ۔ مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں ۔ اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لیے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے ۔ اس طرح ان کا خیال تھا کہ قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخلیہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بناپر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرایہ میں مرتب و منظم کرسکے ، بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو ۔

۱۹۰۹ء میں انہوں نے ہندوستان ریویو میں ایک انگریزی مضمون ,, اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین ،، کے عنوان سے لکھا جس میں یہ تحریر فرمایا کہ اسلام میں نیکی سے مراد طاقت ، قوت اور مضبوطی ہے ۔ بدی سے مراد کمزوری ہے ایک مضبوط جسم میں ایک مضبوط قوت أرادی اسلام کا اخلاقی نصب العین ہے تاکہ مسلمان ان تمام طاقتوں کا مقابلہ کر سکیں ، جو ان کے معاشرتی نظام کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں ، حیات کی تگ و دو میں افراد کی کثرت تعداد ہی وہ عنصر نہیں جو کسی معاشرتی نظام کی بقاء کا ضامن ہے بلکہ افراد کی اجتماعی قوت کردار اس کی بقاء کے لیے ایک قطعی لازمہ ہے ، ان کی تعلیم محض ذہنی تربیت کے لیے نہ ہو ، بلکہ ان کا نظام تعلیم ایسا ہو کہ جو ان کی معاشرتی اور تاریخی روایات کو زندہ کرے اور ان میں خالصۃً اسلامی کردار پیدا کرے ، اس کے علاوہ اسلام صرف مذہب ہی نہیں ، بلکہ ملت یا قوم بھی ہے اس میں مذہب اور ملت ایک دوسرے سے الگ نہیں اس میں قومیت ایک نظریہ ہے جس کی بنیاد علاقائی یا جغرافیائی اصول پر

استوار نہیں کی گئی۔ فرد کے مفاد پر ملت کے مفاد کو اس لیے فوقیت حاصل ہے کہ ملت اسلام کی خارجی شکل ہے اس کے سیاسی دستور کے دو بنیادی اصول ھیں ، اول قانون الٰہی کی حاکمیت اور دوم ملت کے تمام افراد میں مساوات ، اس کا سیاسی نصب العین ملت اسلامیہ کے اتحاد کا ذریعہ صحیح معنوں میں جمہوریت کا قیام ہے ۔ یہ تمام مسلمانوں کی برابری ھی کا اصول تھا جس نے انھیں دنیا کی عظیم ترین سیاسی طاقت بنا دیا ، اس میں ذات پات کے امتیازات کی گنجائش نہیں یہ ایک قابل تقسیم وحدت ہے۔

,,افکار پریشان،، ڈاکٹر صاحب کی ذاتی ڈائری تھی جس میں ۱۹۱۰ء سے وقتاً فوقتاً اپنے کچھ خیالات درج کرتے رہے، اس میں آرٹ ، فلسفہ ، ادب ، سائنس ، سیاست اور مذہب سے متعلق ان کے کچھ خیالات کا اظہار ہے جو ان کے کلام اور تصانیف میں واضح طور پر پیش کیے گئے ھیں ، اس میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سیاسی اقتدار کا زوال قومی کردار کے حق میں تباہ کن ثابت ھوتا ہے اس میں انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ھمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے۔ کہ ھماری گرفت مذھبی اصول پر مضبوط ھو، اگر یہ ڈھیلی پڑی تو ھم کہیں کے بھی نہیں رھیں گے اور عین ممکن ہے کہ ھمارا انجام وھی ھو جو یہودیوں کا ھوا ۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے وطنیت کو بت پرستی کی ایک لطیف صورت قرار دیا ہے۔

غالباً ۱۹۱۰ء میں ,, مسلم کمیونٹی ،، کے عنوان سے ایم۔ اے او کالج علی گڑھ میں ایک مضمون پڑھا ۔ اس میں بھی قومیت کا اسلامی تصور پیش کیا گیا ، ان کے خیال میں اس کا اصل نہ اشتراک زبان ہے ، نہ اشتراک وطن ہے اور نہ اشتراک اقتصادی اغراض ھیں بلکہ وہ اس برادری پر مشتمل ہے جو پیغمبر اسلامؐ نے قائم کی تھی ۔ اسلام صرف مذھب ھی نہیں بلکہ ایک خاص تہذیبی ، قومی اور

وطنی تصور ہے اس کی عصبیت سے صرف قومی اور ملی پاسداری مراد ہوتی ہے ۔ دوسری قوموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا نہیں سکھاتا ۔ انھوں نے اس مضمون میں اس پر بھی زور دیا کہ مسلم قوم کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایک مرکزی اسلامی دار العلوم کا ہونا ضروری ہے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اصول یا سانچہ بھی تیار کیا جا سکے جس میں موجودہ زمانہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا ضروری ہے ۔

دسمبر ۱۹۱۰ء اور جنوری ۱۹۱۱ء کے ہندوستان ریویو میں ان کا ایک انگریزی مضمون ,, اسلام میں سیاسی فکر ،، کے عنوان سے شائع ہوا، اس میں ایک مسلم کامن ویلتھ کا تخیل پیش کیا ۔ جس میں سیاسی انحصار دین پر ہو، کیونکہ اسلام کے نزدیک مذہب اور ریاست ایک وحدت ہے ، اس سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھ گئے کہ قرآن مجید میں تو ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے اگرچہ حکومت کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں اس کی تفصیل بیان کرنے کا معاملہ کئی اور امور پر چھوڑا گیا ہے مگر بدقسمتی سے انتخاب کے بنیادی اصول کی نشو و نما خالص جمہوری خطوط پر نہیں ہوئی ، سیاسی آزادی کے جو نظریات مسلمان یورپ سے مستعار لے رہے ہیں وہ دراصل اسلام ہی کے اپنے تصورات ہیں ، اور ان کا عملی نفاذ آزاد مسلم ضمیر کا جائز مطالبہ ہے ،

۱۹۲۴ء میں ,, اسلام میں اجتہاد ،، کے عنوان سے اسلامیہ کالج لاہور میں سر عبدالقادر کی صدارت میں ایک مقالہ پڑھا جو محفوظ نہیں رکھا گیا لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے کہ یہی مقالہ اضافہ کے ساتھ غالباً ۱۹۳۰ء میں جنوبی ہند کے دورہ میں حیدر آباد میں پڑھا گیا ۔

۱۹۲۵ء میں ایک انگریزی نوٹ ایم ۔ اے او کالج کے صاحبزادہ آفتاب احمد خان کو اس وقت لکھ بھیجا جب وہ علوم اسلامیہ کے مطالعہ کے لیے ایک نیا شعبہ وھاں قائم کرنا چاھتے تھے . اس میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت غور سے اب بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ پہلے وہ علوم اسلامیہ کے متعلق لکھتے ھیں کہ یورپ مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ھوا . یہاں جذبۂ انسانیت یعنی ھیومنزم کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں ، یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں کہ جدید یورپین جذبہ انسانیت کا جو ثمر سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ھوا ہے ، اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے ، مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک ان کے تمدن سے برآمد ھوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ھیں ، مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ھو کہ آئن سٹائن کے نظریے سے ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹیفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث و مباحثے ھوتے تھے تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی نہ معلوم ھو، اسی طرح ان کو جدید استقرائی منطق سے بیگانگی ہے وہ بہت کم ھو جائے، اگر ان کو یہ علم ھو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور و معروف اعتراضات سے وجود میں آیا جو انھوں نے ارسطو کے استخراجی منطق پر عائد کیے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے بھی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے ایسے اساتذہ کا تیار کرنا از بس ضروری ہے جو اسلامی فلسفہ کے ساتھ جدید فلسفہ پر عبور رکھیں، ایسے ھی لوگ جدید علوم کے اخذ و جذب کرنے میں مدد کر سکتے ھیں، اسی طرح ایسے عالم تیار کرنا بھی نہایت ضروری ہے جو اسلامی تاریخ، آرٹ، اور علم تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ھوں اسی

کے ساتھ فقہ میں تحقیق و تدقیق کے لیے موزوں ہوں، اور جو اسلامی افکار و ادبیات کے مختلف شعبوں میں اپنی تحقیقات سے اسلامی تمدن اور جدید علوم کے درمیان حیات ذهنی کی نشو و نما کی جستجو کریں ۔ دینیات کی تعلیم کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے: آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذهنی کاوش کی ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو برسرکار لایا جائے ۔ اسی خط میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ دیوبند اور ندوہ سے ایسے ذهین اور طباع لوگ منتخب کیے جائیں جو قانون محمدی کی از سر نو تشکیل میں معاون ہوں کیونکہ قدیم اور جدید اصول تعلیم کے مابین اور روحانی آزادی اور مادی اقتدار کے مابین دنیائے اسلام میں ایک کشاکش شروع ہو گئی ہے جس کو دور کرنے کی ضرورت ہے ۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب مسلم معاشرہ کی تعمیر نو کے خواہاں تھے، یہ ان کے نزدیک صرف مذہب کی روایتی تعبیر کے فروغ سے ممکن نہیں ، وہ وقت کے جدید تقاضوں اور علوم کی بے انتہا ترقی کے پیش نظر علم کلام اور فقہ کی ازسر نو تدوین کے آرزو مند تھے ، مگر ان کی زندگی کے کسی گوشہ میں نہ تو علم کلام اور نہ فقہ کی جدید تدوین بروئے کار آئی ۔ اور یہ حسرت لے کر وہ اللہ کو پیارے ہوئے ، اجتہاد کا دروازہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اب تک بند ہے ۔

البتہ مسلم قومیت کی جو ترویج ڈاکٹر صاحب نے کی تھی ان کے زمانہ میں ضرور ابھری اور پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام پر ختم ہوگئی ۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہ مسلم قومیت مشرقی بنگال میں بوڑھی گنگا اور برہمپتر میں جاکر غرقاب

ہوئی اور سندھ میں غول بیابانی بن کر منڈلا رہی ہے، بلوچستان کی پہاڑیوں سے بھی ٹکرا رہی ہے اور سرحد کی سرزمین میں خاک آلود ہو رہی ہے،ان کی آرزو تھی کہ ایک مرکزی اسلامی دار العلوم ضروری ہے یہ آرزو بڑی حد تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پوری ہوئی لیکن اس سے وہ پیداوار نہ ہوئی اور نہ ہو رہی ہے جس کے وہ خواہاں تھے، اس کے طلبہ کا اب تک آئیڈیل محض سرکاری ملازمت کا حصول ہے جو بقول ڈاکٹر صاحب حکومت کی محتاجی کا مترادف ہے اور انسانی انفرادیت کے احساس کی نشو و نما کے لیے زھر قاتل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے حوالہ سے مصنف نے یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ھی کو قرار دیا گیا ہے (ص ۱۹۱)مگر ص ۱۹۲ پر ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے لیے کسی حتمی کانسٹی ٹیوشن یا حکومت کی قسم کی تفصیل موجود نہیں ہے کیونکہ ایسے ادارے ملت اپنے ضمیر کی روشنی میں قائم کر سکتی تھی ۔ اور بہرصورت وہ دائمی قرار نہ دیے جا سکتے تھے ، کیونکہ ملت کی بدلتی ہوئی سیاسی ضروریات کے تحت وہ قانون کے تغیر کے پابند تھے (ص ۱۹۲) جب قرآن مجید اور احادیث میں کوئی حتمی کانسٹی ٹیوشن نہیں ، تو یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ قرآن مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ھی کو قرار دیا گیا ہے اور اگر انتخاب اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے تو اس انتخاب کے طرز کی کہیں وضاحت نہیں خود خلافت راشدہ میں اس کا کوئی خاص طرز مقرر نہیں رہا ۔ جب جیسی ضرورت ہوئی اسی لحاظ سے انتخاب کا اصول طے کر لیا گیا اور اگر ملت کو یہ حق رہا کہ وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں زمانہ کے اقتضاء کے مطابق حکومت قائم کریں تو خلافت راشدہ کے بعد جو موروثی ملوکیت قائم

ہوتی رہی تو کیا وہ ملت کے ضمیر کی روشنی اور زمانہ کے تقاضے کے خلاف تھی ، تو اس کے خلاف بغاوت کیوں نہیں ہوتی رہی اور کیوں تیرہ سو ستر سال تک قائم ہوتی چلی آئی ، اور آج بھی خود حجاز کے اندر موروثی ملوکیت قائم ہے ، اگر ملت کا ضمیر اس کو گوارا کرتا رہا یا کر رہا ہے تو پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام میں موروثی ملوکیت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں (ص ۱۹۲) ۔

اس باب میں خلافت اور سلطنت پر لائق مصنف نے بڑی اچھی بحث کی ہے جو آج کل کے سیاسی تقاضے کے لحاظ سے بہت مفید ہے، بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ کلام پاک میں ملک (بادشاہ) کا ذکر تو آتا ہے لیکن جمہوریت کا کہیں ذکر نہیں (انٹروڈکشن ٹو اسلام ، از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۱۰۹، ۱۹۷۴ء اڈیشن) اور جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے قرآن مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے کسی حتمی دستور یا حکومت کی نوعیت کی تفصیل موجود نہیں تو جمہوریت اسلامی ملک کے سیاسی نظام کے لیے ضروری نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کے سیاسی نظام کے ذریعہ قانون شریعت کا نفاذ ہوتا رہے ، اسی اور صرف اسی سے ملت کے ضمیر کی روشنی کی عکاسی ہو سکتی ہے ، خواہ اس کا نفاذ رائے بالغان کے ذریعہ پارلیمانی یا صدارتی نظام حکومت سے ہو، یا ڈکٹیٹر شپ ھی کے ذریعہ سے کیوں نہ ہو ، اگر ایک بادشاہ یا ڈکٹیٹر شرعی قوانین کا پابند ہو یا کم از کم ان کے نفاذ کے لیے کوشاں ہو تو کیا وہ اس لیے پسند نہیں کیا جائے گا کہ وہ رائے بالغاں کے ذریعہ سے منتخب نہیں ہوا ہے ۔

اس باب میں لائق مصنف کی تحریر میں ,, علماء کی موقع پرستی ,, اور ,, صوفیہ کی شعبدہ بازی,, (ص ۱۸۲) جیسے فقروں سے گرانی ہوئی اس قسم کے الفاظ انداز بیان کے خارستان کے لیے تو

ناموزوں نہیں لیکن اسلوب بیان کے سنبلستان میں گراں گذرتے ہیں ۔ دنیا دار یا علمائے سوء کی موقع پرستی ، یا خام اور صاحب فضول صوفیہ کی شعبدہ بازی کہی جاتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا ۔

ایک باب ,, تخلیقی کرشمہ ،، کی سرخی سے شروع ہوا ہے لفظ ,, تخلیقی ،، کھٹکتا ہے ، تخلیقی کرشمہ سے شرک کی بو آتی ہے ، خالق ، مخلوق اور تخلیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تصور آتا ہے مگر ملحدوں اور ترقی پسندوں نے یہ لکھنا شروع کیا کہ فلاں صاحب چار پانچ تخلیقات کے خالق ہیں ، جس سے تخلیقات اور خالق میں تضحیک کا پہلو آ جاتا ہے اس کا لکھنا کچھ ایسا رواج پا گیا ہے کہ اس میں جو ملحدانہ رنگ ہے اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا ، ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے محتاط مصنف کی بھی اس کی طرف نظر نہیں گئی ۔

اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے اسرار خودی اور ,, رموز بے خودی،، جن عوامل کے تحت لکھیں ، ان کی تفصیلات کے سلسلہ میں پہلی جنگ عظیم ، مولانا شیخ عبدالقادر گرامی کے **لطائف ، ڈاکٹر** صاحبؒ کی والدہ کی وفات پر ان کے غمناک جذبات ، سر علی امام کا عشق رسولؐ، نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کی آرزو، فکر معاش میں ان کی پریشانی ، اسی کے ساتھ کبوتروں سے ان کے انس ، مسلم لیگ کی پرانی قیادت سے نوجوانوں کی بداعتقادی ، میثاق لکھنؤ کا ردعمل وغیرہ کا ذکر کرکے اس باب کو نہ صرف پر از معلومات بلکہ دلچسپ بنا دیا ہے ، اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو ان معلومات کے خزانے میں یہ بھی ملے گا کہ ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں فقہ اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ، ۱۹۱۹ء میں تاریخ تصوف لکھنی شروع کی ، لیکن مواد نہ ملنے کے سبب دو ایک باب لکھ کر رہ گئے ، اسی سال

رامائن کو اردو قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا پھر ۱۹۲۱ء میں بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو میں کرنے کا خیال کیا ۔ ۱۹۲۵ء میں ,,اسلام میرے نقطۂ نظر سے ،، لکھنا چاھا ، لیکن ان میں سے کسی کی تکمیل نہیں ہو سکی اور خدا جانے ان کے سینے میں اور کتنے افکار ہوں گے جو سفینے تک منتقل کرنا چاہتے ہوں گے لیکن بیرسٹری کے پیشے میں ان کو اتنی فرصت نہیں ملی ، وہ اپنے علمی عزائم کو پورا کرنے کے لیے حیدر آباد کا گوشۂ عافیت چاھتے تھے ان کو وھاں کی ھائی کورٹ کی ججی مل جاتی تو اس کو قبول کر لیتے اور پھر فکر معاش کی الجھنوں سے آزاد ہو کر اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھتے ، مگر شاید انگریز ان کو ایک خطرہ سمجھ کر وھاں ان کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتے تھے ۔

اس باب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب ,, اسرار خودی، اور ,رموز بے خودی، لکھنے سے پہلے پہلی جنگ عظیم کی ہولناکی کی وجہ سے نئے یورپی تمدن کے حیوان سے آزردہ تھے ، وہ ایسے مرد فردا کی تلاش میں تھے جس کے ذریعہ سے مسلم معاشرہ ازسرنو وجود میں آئے ۔ انھوں نے اسی جذبہ سے اسرار خودی لکھنی شروع کی جس کیلئے شیخ بو علی قلندر کی مثنوی کی بحر کو سامنے رکھا ، ان کا بیان ہے کہ یہ مثنوی لکھتے وقت ان کو احساس ہوا کہ وہ ازخود نہیں لکھ رہے ھیں بلکہ اس کے لکھنے کی ھدایت ہو رہی ہے (ص ۲۰۲) یہ شائع ہوئی تو وہ لکھتے ھیں :

,,اسرار خودی شائع ھوئی تو عبدالرحمن بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں، حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی

ملت ھی میں گم ھو کر ھوتی ہے ، بجنوری کے اس مضمون کے
بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموز بے خودی لکھ کر اس
قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں ، میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر
بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموز بے خودی لکھی جاتی یا
نہ لکھی جاتی ۔ یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر
مجھے احساس ھوا کہ رموز بے خودی لکھا جانا بے حد ضروری
ہے ،، (ص ۲۱۱) ۔

رموز بے خودی کے بعد ایک اور مثنوی ,, حیات مستقبلۂ اسلامیہ،،
لکھنا چاھتے تھے مگر نہ لکھ سکے اوپر کی سطروں کو پڑھ کر یہ
خیال کس قدر باطل ھو جاتا ہے کہ ان کی ان مثنویوں میں یورپی
فلسفیوں کی روح کار فرما ہے ، وہ تو یہ بھی لکھ گئے ھیں :

,,یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست
تاروں کا بنا ھوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے قومیت کے اصول فقہ
صرف اسلام ھی نے بنائے ھیں جس کی پختگی اور پائداری
مرور ایام و اعصار سے متأثر نہیں ھو سکتی ،، (ص ۲۱۱) ۔

یہ دونوں مثنویاں شائع ھوئیں تو ایک خیال یہ تھا کہ اقبالؒ مسیحا
بن کر نمودار ھوئے ھیں ، انھوں نے مردہ دلوں میں زندگی کے آثار
پیدا کر دیے ھیں ، جب یہ مثنویاں حقیقی معنوں میں سمجھی جائیں
گی تو دنیائے اسلام میں وہ لہر اٹھے گی جس کے نتائج نہایت شاندار
ھوں گے (ص ۲۳۹) مگر کچھ حلقوں میں اسرار خودی کی سخت
مخالفت بھی ھوئی ، اس لیے کہ اس میں حافظ شیرازی کو مطعون
کیا گیا تھا اور توحید وجودی کی مذمت تھی، حافظ کو صہبا گسار،
فقیہ ملت مے خوارگان،امام امت بے چارگان اور گوسفند وغیرہ قرار دیا
گیا تھا،اسی کے ساتھ ان کا خیال تھا کہ وجودی تصوف کے سحر ھی
کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی قوت عمل کو شل کرکے رکھ دیا ہے ،

اس کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کی وجہ سے وہ ذوق عمل سے محروم ہو گئے ہیں۔(ص ۲۲۰)

اسرار خودی کے خلاف جو قلمی ہنگامہ ہوا اس کی تفصیل اس باب میں ہے یہ اقبالیات کے سلسلہ کا ایک مفید لٹریچر ہے، مخالفت کرنے والوں میں نمایاں نام ڈاکٹر صاحب کے دوست خواجہ حسن نظامی کا تھا، اکبر الہ آبادی نے بھی تھوڑا سا اختلاف کیا، ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخالفوں کو جو جوابات نثری مضامین میں دیے وہ اس زمانہ کے مشہور اخبار وکیل میں چھپتے رہے، ان کی نشاندھی تاریخ وار اس باب میں کر دی گئی ہے، اس قلمی ہنگامہ سے انھوں نے اپنی شرافت طبع سے اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن میں حافظ شیرازی سے متعلق اشعار اور اس کا دیباچہ نکال دیا لیکن اس داروگیر میں انھوں نے تصوف اور توحید وجودی پر جو اپنے خیالات ظاہر کیے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید ہے۔ وہ بگڑے ہوئے تصوف کو ضرور ناپسند کرتے تھے، خود صوفیۂ کرام نے بھی غلط قسم کے تصوف کی مخالفت کی ہے۔ حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب، اسلامی تصوف کی انجیل ہے، اس میں وہ رقم طراز ہیں کہ ایک صوفی تو صاحب وصول یعنی وصل کرنے والا ہوتا ہے۔ اور ایک صوفی صاحب اصول یعنی صوفی کے اصول پر چلنے والا ہوتا ہے، مگر ایک صوفی متصوف یعنی صاحب فضول ہوتا ہے جو محض مال و منال اور جاہ و حشمت کے لیے اپنے کو مثل صوفی کے بنا لیتا ہے، ڈاکٹر صاحب ایسے ہی متصوفین کے مخالف رہے اور تصوف میں جو غیر اسلامی عنصر آ گیا اس کو بھی پسند نہ کرتے تھے، وہ ان صوفیہ کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو آنحضورؐ کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دیتے ہیں جو دین اسلام سے غیر متعلق ہیں، لیکن ان کا بیان ہے کہ :

,, جو صوفیه آنحضور کی راہ پر قائم هیں اقبال ان کی خاک پا ہے اور ان کی محبت کو سعـادت دارین سمجھتا ہے ،،
(ص ۲۲۷)

ان کی ایک دوسری تحریر ہے :

,,تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے کون مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبت رسول اللہؐ ہے اور جو اس ذریعه سے ذات باری تعالیٰ سے تعلق پیدا کرکے رہے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے هیں،اگر میں تمام صوفیه کا مخالف ہوتا تو مثنوی (یعنی اسرار خودی) میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نه کرتا ،، (ص ۲۲۸) .

لائق مصنف نے بھی اپنے والد بزرگوار کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے که وہ تصوف اسلامیه کے حامی تھے اور آخر دم تک حامی رہے (ص ۲۳۱) ۔

تصوف کا ایک اہم مسئله وحدت الوجود بھی ہے مصنف لکھتے هیں که مثنوی اسرار خودی سے ظاہر ہے که وہ تصوف وجودیه سے متنفر ہو گئے تھے (ص ۲۳۱) ان کی نفرت کی وجه یه تھی که بقول ان کے مسئله وحدت الوجود نے تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا (ص۲۲۰) اس پر اس حیثیت سے بحث کی جا سکتی ہے کـه وحدت الوجود کا مسئله تو سیر و سلوک کی منزلوں میں ذوقی، تجرباتی، وجدانی اور مشاهداتی ہے ۔ خود ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق یه ایک فلسفیانه مسئله ہے (ص ۲۳۰) یه ماورائے عقل بھی ہے ہر شخص اس کو سمجھنے کا اہل نہیں **(ص۲۲۲) کسی زمانه** میں بھی مسلمانوں کا یه اجتماعی یا قومی یا سیاسی مسلک نہیں بنا، جس پر ان کو عمل کرنے کی باضابطه قانونی ہدایت دی گئی ہو ۔

پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ذوق عمل سے محروم ہو گئے، یہ تو سالکین راہ تصوف تک محدود رہا ، اس پر خانقاہوں یا صوفیہ اور علماء کی مجلسوں میں بحثیں ہوتی رہیں ، جو زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ یا عارفانہ رهیں، یہ عوام بلکہ بڑی حد خواص کی عقل سے ماوراء تھیں ۔ اور آج تک وہ وحدت الوجود صحیح طور پر نہ سمجھ سکے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ ان کے دائرہ فکر سے باہر ہے اور صرف صوفیہ اور علماء کے سمجھنے کی چیز ہے،رہا فارسی یا اردو شعراء کے یہاں وحدت الوجود کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیاں تو ایک تو یہ برائے شعر گفتن خوب است اور پھر یہ ایک طرز فکر کی ترجمانی ہے ۔ جس کو ماننا یا نہ ماننا ضروری نہیں، ہاں بعض صوفیۂ کرام نے اس کو اپنا ضروری مسلک قرار دیا ہے مگر بقول شاہ سلیمان پھلواروی اسلامی سیر و سلوک اور مشاہدہ انوار و تجلیات سے اس کا تعلق ضرور رہا ۔ مگر نجات سے اس کا ایسا کوئی واسطہ نہیں (ص ۲۲۶) یعنی اس کے ماننے اور نہ ماننے پر ثواب و عذاب کا سوال نہیں اٹھتا، بعض علماء نے وحدت الوجود کے بعض حامیوں پر تکفیر بلکہ موت کا فتویٰ ضرور دیا مگر یہ دراصل وحدت الوجود کے مسئلہ پر نہ تھا بلکہ وحدت الوجود کی ایسی عارفانہ موشگافی اور فلسفیانہ نکتہ وری ، یا عشق الٰہی میں مجنونانہ سرشاری اور بے راہ روی پر تھا ، جس سے شریعت کی خلاف ورزی ہوتی رہی ، جس طرح تصوف اور اسلامی تصوف کی تفریق کی گئی ہے ، اسی طرح وحدت الوجود اور اسلامی وحدت الوجود کی تفریق کی جائے ، تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں، اسلامی وحدت الوجود دراصل عشق الٰہی کی سرشاری کا دوسرا نام ہے ، اور اسی عشق الٰہی کی لازمی شرط یہ ہے کہ شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو ، مگر

جب اس میں غیر شرعی عناصر آگئے، تو اس کے ماننے والوں کے خلاف وهی رد عمل هوا جو راه سلوک کے صاحب فضول صوفیوں کے خلاف هوا ، ورنه بہت سے ایسے علماء اور صوفیه گذرے هیں جو وحدت الوجود کے حامی رهے لیکن کسی حال میں شریعت کا دامن نہیں چھوڑا ۔ ان هی میں حضرت شرف الدین یحیی منیری، خواجه اشرف جہانگیری سمنانی ، حضرت عبدالقدوس گنگوهی، حضرت خواجه باقی بالله ، حضرت شاه عبدالرحیم ، شاه ابو الرضا (حضرت شاه ولی الله کے والد اور چچا) اور مولانا شاه حاجی امداد الله مہاجر مکی وغیره تھے ۔ اگر ان بزرگان دین پر زندیقیت کا الزام اس لیے رکھا جائے که وه وحدت الوجود کے قائل اور حامی تھے تو پھر هم کو اپنے روحانی ورثه کے بہت هی قیمتی سرمایے سے محروم هونا پڑے گا.

خود حضرت مجدد الف ثانیؒ وحدت الوجود کے مسئله سے نہیں ، بلکه اس کے ان مدارج سے اختلاف کرتے هیں جن میں شریعت کا دامن چھوٹ جانے کا خطره یا احتمال پیدا هوتا ہے ۔

انھوں نے علماء کو یه سمجھایا که اگر وحدت الوجود کی تصریح صحیح طور پر کی جائے تو یه گمراهی نہیں، وه شیخ ابن عربیؒ سے اختلاف ضرور کرتے هیں لیکن وه یه بھی تحریر فرماتے هیں که جو لوگ ان کی مراد کو نہیں سمجھتے وهی لوگ ان پر طعن و ملامت کرتے هیں لیکن وه اپنی اکثر تحقیقات میں حق پر هیں اور ان پر طعنه کرنے والے دور از صواب هیں،(مکتوبات حصه سوم نمبر ۸۸) وحدت الوجود کے مسئله کو صحیح طور پر نه سمجھنے کی وجه سے گمراهی ضرور پیدا هوئی ۔ حضرت مجدد نے اس کا اماله وحدت الشهود سے کیا لیکن شاه ولی الله تحریر فرماتے هیں که شیخ محی الدین ابن عربی کا وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانی کا وحدت الشهود ایک هی شے کے دو نام هیں ۔ وجود و شهود محض

نـزاع لفظی ہے۔ ان میں مطابقت ہے ، مخالفت نہیں (ماخوذ از مکتوب مدنی شائع کردہ ادارہ ثقافت اسلامیہ ، لاهور) مولانا امداد اللہ مہاجر مکی تو سراسر وحدت الوجود کے قائل تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس مسئلہ کو جس وضاحت کے ساتھ شیخ ابن عربی قدس اللہ سرہ، نے سمجھایا اس کا احسان موحدوں پر قیامت تک رہے گا ۔ لیکن انہوں نے اس کی بھی تنبیہ کی کہ ان کو سمجھنے میں خطرات بھی لاحق ہوتے ہیں وہ ولی اور واصل بہ حق ضرور تھے لیکن جذبہ قوی رکھتے تھے آخر زمانہ میں مجذوب ہوگئے، ان کی زبان افشائے اسرار میں بے اختیار ہوگئی تھی، جس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے، (رسالہ دربیان وحدت الوجود، از مولانا امداد اللہ فاروقی چشتی صابری ص۲) مولانا شبلی سوانح مولانا روم میں رقمطراز ہیں کہ وحدت الوجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اهل ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وهی صلہ ہے جو منصور کو دار پر ملا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں .... عالم قدیم ہے ، لیکن وہ ذات باری سے علیحدہ نہیں بلکہ ذات باری هی کے مظاهر کا نام عالم ہے ، حضرات صوفیہ کا یہی مذهب ہے۔ اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا ، بلکہ تمام مشکلات کی بنیاد اس پر ہے کہ عالم اور اس کا خالق دو جداگانہ چیزیں اور ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں ، غرض فلسفہ کی رو سے تو صوفیہ کے مذهب کے بغیر چارہ نہیں ، البتہ یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف هیں لیکن یہ شبہہ بھی صحیح نہیں ۔ قرآن مجید میں بکثرت اس قسم کی آیتیں موجود هیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاهر و باطن اول و آخر جوکچھ ہے خدا هی ہے ، هو الاول هو الآخر هو الظاهر هو الباطن، اس کے بعد مولانا شبلیؒ لکھتے هیں کہ مولانا روم وحدت الوجود کے قائل هیں، ان کے نزدیک تمام عالم اسی

هستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ھیں، اس بنا پر صرف ایک ذات واحد موجود ہے اور تعدّد جو محسوس ھوتا ہے محض اعتباری ہے (سوانح مولانا روم ص ۱۸۲) ۔

ان اکابر علماء کے ان خیالات کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ :

,,مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق تو علماء کا اجماع ہے کہ یہ قطعاً غیر اسلامی ہے ،، (ص ۲۳۲)

,,علمائے اسلام ابتداء سے آج تک تصوف وجودی کے خلاف رھے ھیں ،، (ص ۲۳۳) ۔

ذرا بحث طلب ہے، شاید وہ کسی وقتی جذبہ کی بنا پر یہ لکھ گئے یا کسی ذھنی الجھن کی وجہ سے ان کی یہ رائے تھی، ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود کی پہلی جلد میں ان کی ایسی ذھنی الجھن کی طرف اشارہ کیا ہے (ص ۱۸) ان کی اسی ذھنی الجھن کی وجہ سے توحید وجودی سے متعلق ان کے خیالات کو سمجھنے میں ایسی پیچیدگی پیدا ھو گئی ہے، کہ یہ متنازعہ فیہ بن کر رہ گئے ھیں ، ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی زیر نظر کتاب میں اس سلسلہ میں ان کی جو تحریریں نقل کی ھیں ، ان میں ایک یہ بھی ہے :

,,فلسفۂ یورپ بہ حیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ھوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ھوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا ،، (ص ۲۳۰) ۔

آخری سطروں سے تو ظاھر ہے کہ وہ پہلے وحدت الوجود کے قائل تھے ، لیکن اس خیال کو ترک کرنے میں ان کو ایک دماغی اور قلبی

جہاد کرنا پڑا، ابتدائی دور میں ان کے وحدت الوجود کے قائل ہونے کی تائید خلیفہ عبدالحکیم کی تحریر سے بھی ہوتی ہے وہ اپنی کتاب ,,فکر اقبال،، میں لکھتے ہیں کہ ,,اسرار خودی،، کے شایع ہونے کے بعد ان کے کیمبرج کے استاد میک ٹیگرٹ نے انہیں لکھا کہ طالب علمی کے زمانہ میں تو تم زیادہ تر ہمہ اوستی معلوم ہوتے تھے ، اب معلوم ہوتا ہے کہ ادھر سے ہٹ گئے ہو، (فکر اقبال ص ۳۳۵) خلیفہ عبدالحکیم یہ بھی لکھتے ہیں کہ بانگ درا کی ,, شمع ،،، ,,جگنو ،، اور ,, سوامی رام تیرتھ ،، میں وحدت الوجود کا تصور جھلکتا ہے (ص ۳۳ ـ ۳۳۵) گو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو بھی نقل کر دیا ہے کہ جگنو میں مظاہر فطرت کی اساسی وحدت ہے جو صوفیہ کے ہمہ اوست کے نظریے سے الگ چیز ہے مگر خلیفہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ سوامی رام تیرتھ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بہتر وحدت الوجود پر اور کیا کہہ سکتے ہیں (ص ۳۳۸) اس بحث میں خلیفہ صاحب یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اقبال کی توحید، توحید قرآنی ہے جو فلسفیانہ اور متصوفانہ وحدت الوجود سے متمیز ہے (ص ۳۳۵) ـ

آج کل پروفیسر جگن ناتھ اقبالیات کے بڑے ماہر ہو رہے ہیں ، انھوں نے اپنی کتاب ,, اقبال اور اس کے عہد میں ،، اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے ان کی رائے سے اختلاف ہو لیکن یہ پڑھنے کے لائق ہے جس کا خلاصہ یہ ہے

علامہ اقبال کا سفر جادۂ تصوف چالیس برس کا ہے اس کی ابتداء اس مقام سے ہوتی ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ اس منزل میں انھوں نے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کی تفریق نہیں کی ہے۔ اس دور میں ان کی نظموں میں سے ,,گل پژمردہ،، ,,, زھد اور رندی ،، ، ,, بوئے گل ،، ، ,, تصویر درد ،، اور ,, شمع ،، میں ایسے اشعار ہیں جو وحدت الوجود کے اثر سے کہے

گئے ۔ ,,شمع،، تو ویدانت یا وحدت الوجود کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظم ہے اس انداز کی نظمیں ۱۹۱۰ء تک کے کلام میں ملتی ہیں ۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں لکھی گئیں. جن میں وحدت الوجود کے عام نظریه کی صریح مخالفت موجود ہے ، ان میں وحدت الوجود کو غیر اسلامی قرار دیا ہے مگر ان دو مثنویوں کے بعد ان کی جو کتابیں شایع ہوئیں ان میں وہ وحدت الوجود کی قرآنی تعبیر کے قائل ہو گئے ، اس میں کوئی تضاد نہیں ، ایک بالغ نظر مفکر کی تحقیق و تلاش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے فکر کی تبدیلی کا یہ دور ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا ۔ پیام مشرق میں اس فکر کے ماتحت بہت سے اشعار ہیں ۔ زبور عجم ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی ، تو اس کی اکثر غزلوں میں اول سے آخر تک وحدت الوجود کی تلقین ہے ، ان کی گلشن راز جدید میں اس نظریہ کی اشاعت بہت عمدہ طریقہ سے کی گئی ہے لیکن ایک بنیادی فرق شیخ اکبر اور علامہ اقبال کی تعلیم میں آخر تک رہا اور وہ فرق عقیدے کا نہیں ، بلکہ طریق کار کا ہے ، شیخ اکبرؒ انائے مطلق کو اصل قرار دے کرانائے مقید کو اس کی ایک شان قرار دیتے ہیں ۔ لیکن اقبال انائے مطلق کے عوض انائے مقید کو اپنی فکر کا اساسی نقطہ بتاتے ہیں یعنی وہ خودی سے خدا تک پہنچتے ہیں ۔ یہی چیز ان کی ,, جاوید نامہ ،، ,, بال جبریل ،، ,, ضرب کلیم ،، ,, پس چه باید کرد ،، اور ,,ارمغان حجاز،، میں نظر آتی ہے (ص ۸۵ ۔ ۶۸) ۔

جناب سید نذیر نیازی ایک عرصہ تک ڈاکٹر صاحب کے ضمیر بردار بلکہ محرم راز رہے ، وہ اپنی کتاب دانائے راز میں لکھتے ہیں کہ اقبال وحدت الوجودی کبھی نہیں تھے، نه آخر الامر ہو گئے (ص ۳۵۱) اس کو ثابت کرنے میں خاصی لمبی بحث کی ، جس کے دلائل

میں ڈاکٹر صاحب کے بجائے ان کے ذاتی خیالات زیادہ نمایاں ھیں ، وہ لکھتے ھیں کہ :

,,ایک اور غلط فہمی جو دور اول کی بعض نظموں یا آگے چل کر بعض تحریروں کی بنا پر پیدا ھوئی یا پیدا کر دی گئی، یہ تھی اور شاید اب تک ہے کہ محمد اقبال ایک زمانے میں ھندی قومیت کی طرح وجودی تصوف کے گرداب میں پھنس گئے تھے ، حالانکہ ان کی تعلیم و تربیت جس گھر اور جس استاد کی نظر کیمیاء اثر سے ھوئی اس کا لحاظ رکھ لیا جاتا تو ایسی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں تھی،، (ص ۴۲۸) ۔

لیکن وہ آگے چل کر یہ بھی تحریر کرتے ھیں :

,,ان کے والد ماجد کو ابن عربیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت تھی جو بعض صورتوں میں غلو کا رنگ اختیار کر لیتی ،، ۔

یہ تحریر کرکے ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی نقل کرتے ھیں :

,, برسوں تک فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا درس ھمارے گھر میں رھا ، بچپن میں ان مسائل کی سمجھ نہیں تھی ..... جب میں نے عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا جوں جوں علم اور بڑھتا گیا ، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ھوتی گئی ،، (ص ۴۳۴) ۔

پھر یہ لکھنا کہاں تک صحیح ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت جس گھر میں ھوئی اس میں اس غلط فہمی کی گنجائش نہیں ۔ جناب نذیر نیازی صاحب یہ بھی لکھتے ھیں :

,,تکمیل تعلیمؔ سے بہت پہلے وحدت الوجود کی بحث پورے طور پر ان کے ذھن میں تھی لیکن بطور ایک نظریے کے اس زمانہ میں انھوں نے اس کی موافقت یا مخالفت میں کوئی رائے قائم نہیں کی ، وہ سمجھتے تھے، یہ بھی تصوف کا ایک نظریہ ہے ،، (ص ۴۳۳) ۔

آگے چل کر رقمطراز ہیں :

,,انھوں نے ہر خیال اور ہر عقیدہ پر نظر رکھی ، کسی خیال یا عقیدہ کو صحیح سمجھا تو عارضی طور پر ۔ ان کے غور و تفکر کا سلسلہ ابھی جاری تھا ، انھوں نے ان مسائل اور ان عقائد سے تعرض نہیں کیا جن کے بارے میں ایک زمانے تک یہ سمجھتے رہے کہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں گے ، ان میں ایک عقیدۂ وحدت الوجود بھی تھا ،، (ص ۳۳۵) ۔

اس تحریر سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی زمانے میں یہ سمجھتے رہے کہ عقیدہ وحدۃ الوجود اپنی جگہ پر ٹھیک ہوگا. لیکن ڈاکٹر صاحب کی جو ایک تحریر اوپر نقل کی گئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ نہ صرف اس کو ٹھیک سمجھتے تھے بلکہ وحدت الوجود سے بھی متاثر ہو گئے تھے، لیکن محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا ، اور اس کو ترک کرنے میں ان کو خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ وہ وحدت الوجودی کبھی نہیں تھے، اور جو اہل نظر ڈاکٹر صاحب کے آخری دور کے اشعار سے ان کے مسلک توحید وجودی کو ثابت کرتے ہیں ان کے متعلق جناب سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں ۔ کہ یہ سطحی مشابہتیں ہیں جو بظاہر وجودی تصورات نظر آتے ہیں (ص ۳۳۳) پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ جذبات اور کیفیات جن کا اظہار ایسے اشعار میں ہوتا ہے وہ وجودی ذہن سے مختص نہیں، شہودی ذہن سے ان کا ویسا ہی تعلق ہے (ص ۳۵۴) ۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا بھی تجزیہ ملاحظہ ہو، وہ اپنی زیر نظر کتاب کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں :

,,ذہنی ارتقا کے ...... مرحلے میں اقبال کو تصور وحدت الوجود ہی نے عالم تشکیک سے نکالا .... اس دور میں وجودی فلسفہ

کے زیر اثر بعض اشعار تصوف کے روایتی نظریۂ فنا کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ گویا اقبال کے نزدیک نفس کی انفرادیت ایک فریب ہے جو نمود حق کے بعد خود بخود مٹ جاتا ہے اور پھر وہی ازلی حقیقت ,, خدا ،، رہ جاتی ہے ۔ اس عہد میں اقبال نے وجودی فلسفہ کی روشنی میں اپنے سیاسی تصورات کی بنیاد رکھی ،، (ص ۸۴)

ڈاکٹر جاوید اقبال یہ بھی لکھتے ہیں کہ

,,اقبال پر یورپ آنے سے کئی برس قبل لاهور میں طالب علمی کے زمانے میں اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں کے یورپی فلسفہ عقلیت کا کھوکھلا پن ظاہر ہو چکا تھا۔ اس وقت انھوں نے اس کا قابل فہم جواب وجودی تصوف میں پایا تھا (ص ۱۳۵) ۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی پہلی جلد میں یہ بھی لکھا کہ ایک دور ایسا بھی آیا جب :

,,فلسفہ ان کے نزدیک ایک بیکار ذهنی مشق کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا اور وجودی تصوف کی تعلیمات کو وہ افیون کا نشہ سمجھنے لگے تھے ،، (ص ۱۳۵) ۔

اپنی زیر نظر کتاب یعنی زندہ رود کی دوسری جلد میں بھی یہ لکھتے ہیں کہ :

,,مثنوی اسرار خودی سے متعلق بحث سے ظاہر ہے کہ اقبال تصوف وجودیہ سے متنفر ہو گئے تھے۔ لیکن وہ تصوف اسلامی کے حامی تھے ،، (ص ۱۳۵) ۔

ان کی اس رائے کو پڑھنے کے بعد راقم نے ایک خط میں ان سے دریافت کیا کہ کیا وجودی تصوف سے ڈاکٹر صاحب کی نفرت آخر وقت تک رہی ؟ اور کیا اس کی بحث تیسری جلد میں آئے گی ؟ اس

کا جواب حسب ذیل ہے :

,,جی ھاں ! تیسری اور آخری جلد میں بھی اقبال اور وحدت الوجود کی بحث ھوگی ۔ بلکه ان کے فلسفه کے مختلف معروف پہلوؤں کی ارتقائی منازل پر بھی لکھا جائے گا ۔ اس تیسری جلد میں اس بحث کی تائید تو نہیں البته اس کی نوعیت مختلف ھوگی ، اور نتیجه بھی مختلف نکالا جائے گا ۔ میری ذاتی رائے میں وہ آخری دور میں وحدت الوجود کے قائل تو نہیں ھوئے بلکه انھوں نے ایک تیسرے راسته کی رھبری کی ہے۔ جس کا تصوف نے ابھی تک کوئی خاص نام نہیں رکھا یا جس کے لیے خاص اصطلاح وضع نہیں کی ۔ بات یه ہے که ارتقائی منازل سے گذرنے کے بعد ان کے تصوف کا راسته نه تو وحدت الوجود کا تھا ، نه وحدت الشہود کا ۔ وحدت الوجود میں تو قطرہ سمندر میں گر کر فنا ھو جاتا ہے اور وحدت الشہود میں خدا کی ذات ان الله ثم وراء ثم وراء والی صورت ہے لیکن اقبال کے مطابق خودی مطلق اور خودی محدود میں فراق بھی برقرار رھتا ہے اور ساتھ ساتھ بھی ھیں ، جیسے آفتاب کی ضیاء میں موم بتی کی روشنی یا سمندر کے پانی میں موتی ، یه وحدت الوجود کی کیفیت نہیں ، گو کہا جا سکتا ہے که اس سے مشابه صورت ہے ، مگر میرے خیال میں یه تیسری صورت ہے کیونکه وجودی تصوف کے برعکس یه تو کثرت بقاء کی صورت ہے لیکن اقبال ھم پر واضح کرتے ھیں که وحدت کی ضد کثرت ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں بلکه شرک ہے۔ اس لیے اقبالی فکر کو توحید ھی کی روشنی اور ضیاء میں واضح کیا جا سکتا ہے۔ خیر ، میں صرف یه بتانا چاھتا تھا که یه بحث تیسری جلد میں بھی آئے گی ۔ جہاں وضاحت سے اپنا نقطۂ

نگاہ بیان کروں گا۔ شاید اس خط میں واضح نہ کر سکا ہوں۔

اب زندہ رود کی تیسری جلد کا انتظار بے چینی سے ہے کہ اس مسئلہ میں ڈاکٹر صاحب کا نظریہ کہاں تک بدلا، مگر یہ باتیں نوک قلم پر آ رہی ھیں کہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں عشق کا جو تخیل ہے وہ آخر کس کا عشق ہے، وھی عشق تو نہیں جو اسلامی وحدت الوجود کے حامیوں میں ھوتا ہے، عشق ڈاکٹر صاحب کے یہاں ان کے استاد معنوی پیر رومیؒ کی طرح ,, اضطرلاب اسرار خدا ،، ہے اور جب وہ یہ کہتے ھیں، درخت کی پتیوں اور لالہ میں عشق ھی کا رنگ موجود ہے

ھماری روح عشق کی بلا میں گرفتار ہے، اگر اس دنیا کو چیر کر دیکھا جائے تو اس کے اندر عشق کی خوں ریزی دکھائی دے گی، عشق کے آفتاب کی شعاع سمندر کو چیر کر رکھ دیتی ہے مچھلیاں سمندر کی تاریکی میں عشق کی آنکھ سے راہ پاتی ھیں، یہ آسمان کی گردش عشق کی موجیں ھیں، اگر عشق نہ ھو تو دنیا ٹھٹھر کر رہ جائے۔ اگر عشق نہ ھو تو جمادات سے نباتات نہ پیدا ھوں اور اگر عشق نہ ھو تو نامیات یعنی سبزہ زار اپنی نوعیت سے محروم ھو جائے، عشق ھی زندگی کی شریعت اور آئین ہے، تہذیب کی اساس دین ہے اور دین دراصل عشق ہے، عشق ظاھر میں سوزناک اور آتشیں نظر آتا ہے لیکن باطن میں یہ نور رب العالمین ہے اور جب وہ یہ کہتے ھیں :

اگر ھو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ھو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

کافر بیدار دل پیش صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

عقل و دل و نگہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ھو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات

ان اشعار میں اسلامی وحدت الوجود تو نہیں لیکن وحدت الوجود کے پرستاروں کے شطحیات کی جھلکیاں ہیں ۔ اور جب اقبال انسان کے متعلق یہ کہتے ہیں ع

هستی او ظل اسم اعظم است

یا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی کو کھو دیا ہے اور وہ کائنات کی ہر چیز میں آدمی کو تلاش کر رہا ہے۔ آدمی کو لالہ اور نرگس کی دلآویزیوں ، پرندوں کے سینوں ، پھولوں کی خوشبوؤں ،دنیا کی ہر چیز کی رنگینیوں ، محلوں ، وادیوں اور ماهتاب کی کرنوں میں ڈھونڈتا ہے ، زندگی کا موتی انسان کے جسم خاکی میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور اب یہی فیصلہ کرنا ہے کہ یہ دنیا خود آدمی ہے یا خدا وند تعالیٰ ہے ،

در خاکدان ما گہر زندگی گم است

ایں گوهرے کہ گم شدہ مائیم کہ اوست

آخر یہ کیا ہے ؟ اسلامی وحدت الوجود کا حامی اپنے عشق الٰہی کی سرشاری میں پھولوں کی رنگینی ، سبزہ کی شادابی ، حسن کی رعنائی ، نغمہ کی دلآویزی ، سمندر کی طغیانی ، سیلاب کی تباہ کاری ، زلزلہ کی غارتگری اور انسانوں کی تباہی و بربادی میں سب چیزوں میں خدا ہی خدا یا اس کے جمال و جلال کو دیکھتا ہے۔ ان دونوں میں جو بھی فرق ہے اس کا تعلق نزاع لفظی ہے۔ ان میں اگر بظاہر پوری مطابقت نہیں تو پوری مخالفت بھی نہیں ہے۔

کتاب کا تیرھواں باب خانہ نشینی کے عنوان سے ہے جو اور ابواب کی طرح دلچسپ اور پر از معلومات ہے ، اس میں اس زمانہ کی ہندوستانی اور بین الاقوامی سیاست کا بڑا عمدہ تجزیہ اور تبصرہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹ کر لکھنے کی بڑی مہارت ہے ، اس کا اظہار ان کی پہلی جلد کے

ابواب میں بھی ہو چکا ہے، وہ اپنے اجمال میں تفصیل اور ایجاز میں اطناب کا رنگ پیدا کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ھیں ۔ ان سیاسی سرگرمیوں میں ڈاکٹر صاحب کا حصہ زیادہ نہیں رہا ، شاید اس لیے کہ انھوں نے کبھی سیاسی لیڈر بننا پسند نہیں کیا ۔ پھر وہ سیاسی رائے اگر رکھتے تو اس کو تسلیم کرانے میں محاذ آرائی کرنا بھی ان کی فطرت سلیم کے خلاف تھا ، اس کے علاوہ سیاست میں ان کی نفسیات کا اندازہ اس لطیفہ سے بھی ہوگا کہ مولانا محمد علی چار سال کی نظر بندی کاٹ کر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو تحریک خلافت کے قائد کی حیثیت سے لاہور پہنچے ، ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے ان کے انار کلی والے مکان میں پہنچے ، ڈاکٹر صاحب اپنی بیٹھک میں دھسہ اوڑھے بیٹھے حقہ کے کش لگا رہے تھے، مولانا محمد علی سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی، ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ھی بولے: ظالم!ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ھیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ھیں لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقہ کے کش لگاتا رہتا ہے۔ گویا کچھ ھوا ھی نہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا:"مولانا میں تو قوم کا قوال ھوں، اگر قوال خود ھی وجد و حال میں شریک ھو کر ھو حق میں تہ و بالا ھونے لگے تو قوالی ھی ختم ھو جائے" (ص ۲۴۷)

مگر وہ گرد وپیش کے سیاسی واقعات سے متاثر ھوتے رھے اور اپنے تاثرات کا اظہار اپنی نظموں میں کرتے رھے ، اس کی بھی تفصیل لکھ کر مصنف نے اپنے ناظرین کو محظوظ کیا ہے مثلاً جلیانوالہ باغ کے المناک حادثے پر یہ اشعار کہے :

ھر زائر چمن سے کہتی ہے خاک یاس
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مولانا محمد علی گرفتار ہو کر قید کیے گئے تو ایک نظم اسیری کے عنوان سے لکھی ، اس کا آخری شعر یہ ہے :

شہپر زاغ و زغن دربند قید وصید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ است

مولانا محمد علی خلافت کا وفد لے کر لندن گئے تھے ، وہاں سے یہ وفد ناکام واپس آیا تو لکھا :

بہت آزمایا ہے غیروں کو تونے مگر آج ہے وقت خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ هم جسکو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چنیں عار ناید کہ از دیگراں خواستن مومیائی

ترک موالات اور تحریک خلافت کے زمانے میں آغا خان نے محمد علی جناح کے ذریعہ سے مسلم لیگ کے احیاء کی کوشش کی ، جس سے عام خیال ہوا کہ اس کے ذریعہ سے محکومانہ سیاسی حکمت عملی پیش کی جائے گی، اس وقت ڈاکٹر صاحب نے اشعار لکھ کر آغا خان اور محمد علی جناح دونوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا :

لندن کے چرخ نادرہ تن سے پہاڑ پر
اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں
اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے
مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب
اس دین میں ہے ترک سواد حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجاب ,, غیبت کبریٰ ،، دریدہ است

جنگ عظیم کے بعد فاتح اقوام کی دھاندلی، ان کی ابلیسانہ سیاست . سرمایہ داروں کی عیاری سے مزدوروں کی بیداری، ترکان آل عثمان کی بے بسی اور بے دست پائی سے متاثر ہوئے تو ایک نظم لکھی جو خضر راہ کے نام سے مشہور ہے ، اس کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ کے تیس ہزار کے مجمع میں پڑھا ، اور اس کا جب یہ شعر پڑھا تو رو پڑے :

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا مجمع بھی اشکبار تھا :

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

مئی ۱۹۲۲ء میں لاھور کے شاہ عالمی دروازہ کے باھر ھندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا ۔ مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی بننی چاھیے ، یہ ھندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا ۔ مسلمانوں نے مندر کے پاس ایک قطعۂ اراضی لے کر نماز عشاء کے بعد اس کی بنیاد ڈالی اور صبح تک مسجد کی عمارت مکمل کر دی ، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کے اس جذبۂ دینی سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی ، جس کا ایک چبھتا ہوا شعر یہ ہے :

مسجد تو بنالی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ ظاھر ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب عملی سیاست میں تو زیادہ پیش پیش نہیں رہے لیکن وہ ھر سیاسی معاملہ میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے ۔ مثلاً وہ خلافت عثمانیہ کا کوئی مستقبل نہیں دیکھ رہے تھے ۔ اس کے بجائے وہ برٹش کامن ویلتھ

کی طرح مسلم کامن ویلتھ چاہتے تھے ، ان کی زندگی میں ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا ۔ مگر آج کل اسلامی ممالک کے سربراہوں کی اجتماعی کوشش میں اس خواب کی تعبیر نظر آتی ہے ۔ مسئلہ خلافت پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدم تعاون کی تحریک میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف رہے ، اس لیے کہ انھیں خدشہ تھا کہ کہیں ایسے اشتراک اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قومیت متحدہ کے داعی ان کی علیحدہ ملی حیثیت کو ختم نہ کر دیں ، (ص ٢۴٨) جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو گاندھی جی نے ان کو لکھا کہ وہ اس کا چارج لیں لیکن اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ ہندوستانی مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں ۔ بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں بلکہ تکنیکاتی تعلیم کی ضرورت ہے (ص ٢٩٢) وہ مسلم ممالک میں مغربی طرز کی نیشنلزم کے فروغ سے بھی خوش نہ تھے (ص ٢٦٣) لیکن ان کا عقیدہ رہا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا ۔ اور جس قوم نے آج تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے ، اس کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا (ص ٢٦٥) اور پھر ٨ دسمبر ١٩١٩ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی عمر یورپ کے فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی ۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغ بہت اچھے عطاء فرمائے تھے ، اگر یہ قویٰ دینی علوم پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسولؐ کی کوئی خدمت کر سکتا ..... بہرحال جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے کیا لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئیے تھا اور زندگی تمام و مکمل نبی کریمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہئیے تھی (ص ٢٦٥)

اسی باب میں کشمیر کے ایک پیرزادہ کا ذکر ہے جس نے اپنے ایک خواب میں دیکھا کہ نماز کی ایک صف میں ڈاکٹر صاحب

حضور سرور کائنات کے دائیں جانب کھڑے ھیں (ص ٢٦٧) کیا عجب کہ روزمحشر میں ڈاکٹر صاحب اپنے پاک اور مطہر اسلامی جذبات کی بناء پر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب کھڑے نظر آئیں ۔

اس کتاب کا آخری باب"ہندو مسلم تصادم کاماحول ،،کے عنوان سے ہے جس میں ہندوستان کے اندر اس زمانہ میں جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان کی تفصیل بیان کرکے ان کے اسباب کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے ۔ ان اسباب سے ناظرین کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ان کا مطالعہ ہر لحاظ سے مفید ہوگا ، اسی کے ساتھ مسلم لیگ کے احیاء اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سرشادی لال کا تعصب اور ان کی کردار شکنی کی بھی تفصیل ہے۔ آخر میں جب ڈاکٹر صاحب نے نجد کے سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دیا تو اس پر بعض علماء نے ان پر جو کفر کا فتویٰ دیا اس کا بھی ذکر ہے۔ مگر اس باب میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی اور خانگی حالات کی جو تفصیل ہے یا اس زمانہ میں ان سے جو شعری کمالات کا اظہار ہوا ، اس سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے ، لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سرشادی لال نے ڈاکٹر صاحب کے لیے خان صاحب کے خطاب کی سفارش کرنے کا ارادہ کیا ، مگر ان ہی دنوں گورنر پنجاب کی سفارش سے ان کو سر کا خطاب ملا تو بعض اخبارات کے کالموں میں ان پر طنز آمیز چوٹیں کی گئیں اور ان کے پرانے دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے ان کو ایک خط میں لکھ کر یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اب وہ شاید آزادی رائے کا اظہار نہ کر سکیں ، انھوں نے اس کا جو جواب دیا اس سے وہ آسانی سے سمجھے جا سکتے ھیں لکھتے ھیں :

,,وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے ، سو قسم ہے

خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے
اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے
مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں . دنیا
کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی.
ان شاء اللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن
ہے، (ص ٢٦٩)

یہ خطاب ان کو جنوری ١٩٢٣ء میں ملا، اور اوپر انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا اس کا ثبوت مارچ ١٩٢٣ء میں طلوع اسلام لکھ کر دیا ، جب ترک مجاهدین نے سمرنا سے یونانیوں کو نکال کر اور قسطنطنیه پر قبضه کرکے اپنی هستی کو به نوک شمشیر تسلیم کرایا ، اس نظم کے متعلق اهل الرائے کا خیال ہے که اس نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا سہارا دیا ، ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراط مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا ـ

اسی سال یعنی مئی ١٩٢٣ء میں ان کی مشہور مثنوی , پیام مشرق ، شائع ہوئی تو بعض حلقوں سے یه آواز اٹھی که وہ انتہائی خیالات رکھنے والے بولشویک اور اشتراکی ہوگئے ، انھوں نے اس کی تردید ٢٤ جون کے زمیندار میں یه لکھ کر کی :

,,بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے .... میں مسلمان ہوں ، میرا عقیدہ ہے ، اور یه عقیدہ دلائل و براهین پر مبنی ہے که انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے ـ اس میں شک نہیں که سرمایه داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یه نہیں که معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا که

بالشویک تجویز کرتے ھیں ، قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب
حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث ، حرمت ربوٰ ، اور
زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ
رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے.... مغرب کی سرمایہ
داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہے
اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے .... مجھے
یقین ہے کہ خود روسی قوم اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے
سے معلوم کرکے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور
ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں
گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے ۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا
اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ھی محمود کیوں نہ ھو ان کے
طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی ۔
ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل
اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ۔
ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی
تعلیم پر نظر غائر ڈالیں ، مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات
کا حل اس کتاب میں پائیں گے " (ص ۲۷۹) ۔

یہ تحریر ۵۸ سال پہلے لکھی گئی تھی ، لیکن ڈاکٹر صاحب کے
اس پیام میں اب بھی تازگی ہے ، جو مسلمانوں کے لیے قابل غور اور
لائق فکر ہے ۔

اس باب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی پیدائش کی جو تفصیل
لکھی ہے وہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہے ، وہ لکھتے ھیں :

"اقبال کی دونوں بیویاں سردار بیگم اور مختار بیگم ۱۹۱۳ء سے
۱۹۲۳ء تک اولاد سے محروم رہیں، مگر عجیب اتفاق ہے کہ
۱۹۲۴ء کے اوائل میں دونوں قریباً ایک ھی وقت امید سے ہوئیں

دونوں میں آپس میں بیحد محبت تھی ، اس لیے طے پایا کہ دونوں اپنی اپنی اولاد کا تبادلہ کر لیں گی ، اور ایک کی اولاد دوسری پالے گی ۔ اقبال کو جب معلوم ہوا کہ ان کی دونوں بیگمات امید سے ہیں تو ۱۹۲۴ء کی گرمیوں میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مزار پر سرہند شریف پہنچے اور دعاء کی کہ اگر خدائے تعالیٰ انھیں اولاد نرینہ سے نوازے تو پھر اسے احیائے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اسی طرح انجام دینے کی توفیق عطا کرے جس طرح احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو عطا کی تھی" (ص ۲۸۲) ۔

مختار بیگم کی وفات تو بچے کی پیدائش سے پہلے ہو گئی ، لیکن سردار بیگم سے جاوید اقبال کی ولادت باسعادت سیالکوٹ میں ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ہوئی ۔ اس لحاظ سے وہ ستاون سال کے ہو چکے ہیں ، یہ وہ عمر ہے جس میں وہ اپنے والد بزرگوار کی خواہش کے مطابق احیائے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں کوشاں ہو سکتے ہیں ۔ خدا کرے یہ صورت کسی طرح عمل میں آ جائے ۔ آمین ۔

ان کی والدہ کے کردار کا یہ بہت ہی روشن پہلو ہے کہ مختار بیگم کی وفات کے بعد ان کی جدائی ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی گھر میں تنہا بیٹھی رویا کرتی تھیں ، ڈاکٹر صاحب نے انھیں صبر کرنے کی تلقین کی ، مگر وہ یہی کہتیں کہ مرحومہ کی گیارہ سالہ رفاقت کے بعد وہ شدید تنہائی محسوس کرتی ہیں ، انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مرحومہ کی کسی خالہ زاد بہن سے ڈاکٹر صاحب عقد کر لیں تاکہ مختار بیگم کی بجائے ان کی بہن کی رفاقت میسر آ جائے ، لیکن یہ صورت ممکن نہ ہو سکی ، مگر سردار بیگم کا یہ کردار ان عورتوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو سوکنوں کو کسی حال میں پسند نہیں کرتی ہیں ۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان سب واقعات کو کچھ ایسے انداز میں لکھا ہے کہ اس زندہ رود شاعر مشرق کے سوانح حیات کو پڑھتے وقت کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک جلیل القدر شاعر کی سوانح عمـری پڑھ رہے ہیں جس میں حقیقت اور معروضیت ایسی ہے کہ ان کے داغوں اور پھوڑوں کے آبگینے سامنے آ جاتے ہیں ، کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم شعر و ادب کے ایک ناقدانہ تبصرہ سے محظوظ ہو رہے ہیں، کبھی ہم ملکی اور بین الاقوامی سیاست کی محفلوں منتقل ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی رومانی ناول پڑھ رہے ہیں اور جب یہ کتاب ختم ہوئی تو یہ اثر طاری ہوا کہ ایک لذیذ اور شیریں کہانی ختم ہو گئی جو ابھی ختم نہ ہونی چاہیے تھی ۔ اب اس کی تیسری جلد کا انتظار بے چینی سے رہے گا ۔ اس کتاب کے مطالعہ کے زمانہ میں جناب سید نذیر نیازی کی کتاب , دانائے راز ، بھی تبصرہ کے لیے پہنچی ، دونوں میں بڑا فرق محسوس ہوا، ، زندہ رود کے پڑھنے میں جو لذت محسوس ہوئی وہ دانائے راز میں محسوس نہیں ہوئی ، خیال ہوا کہ , دانائے راز ، کے مصنف کی طرح , زندہ رود ، کے مصنف کو بھی کافی عرصہ علامہ کے ساتھ رہنے اور ان کے ضمیر بردار ہونے کا موقع ملتا تو پھر معلوم نہیں , زندہ رود ، اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کیا چیز اور ہو جاتی ۔ اس کے پڑھنے میں لذت اس لیے بھی ملتی ہے کہ یہ ایک باپ کی کہانی ایک بیٹے کی زبانی ہے ، مگر اس کا انداز بیان کچھ ایسا ہے کہ شروع سے آخر تک یہ ایک بیٹے کے بجائے ایک غیر جانبدار اور حقیقت پسند مصنف کی قلمی گل کاری معلوم ہوتی ہے ۔

●●●